QUARTERLY, PEER REVIEWED
al-amir
ISSN(P): 2790-931X ISSN(E): 2790-9328
E-Mail: editor.alamir@gmail.com

نظریہ جمہوریت: اسلامی سیاست و معاشرت کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ

The Concept of Democracy in the Context of Islamic Political and Social Thought: An Analytical Study

Farahat Bibi
PhD Scholar, Dept. of Islamic Thought and Culture (IHA), Khwaja Fareed University of Engineering & Information Technology (KFUEIT), Rahim Yar Khan, Pakistan. Email: farhatwali1990@gmail.com
Dr. Mazher Hussain Bhadroo
Lecturer, Dept. of Islamic Thought and Culture (IHA), Khwaja Fareed University of Engineering & Information Technology (KFUEIT), Rahim Yar Khan, Pakistan. Email: mazharhussainbhadroo@gmail.com
Dr. Muhammad Akram Hureri
Subject Specialist, Directorate of Education, Punjab Workers Welfare Fund, Lahore, Pakistan. Email: mahurary@gmail.com

Submission Date:
05 Jan 2026
Review Date:
10 Jan 2026
Acceptance Date:
25 Jan 2026
Publication Date:
05 Feb 2026

Article Link:
https://alamir.com.pk/index.php/ojs/article/view/340

Abstract:

In contemporary political discourse, democracy—characterized by popular sovereignty, public representation, and freedom of expression—is widely recognized as a benchmark for modern governance. However, its philosophical intersection with Islamic political thought presents a nuanced dialogue between secular human authority and divine sovereignty (Ḥākimiyyah).

This study aims to conduct a critical and comparative analysis between Western democratic principles and Islamic political and social frameworks to evaluate their points of convergence and divergence.

The research employs a qualitative analytical and comparative research methodology, drawing upon primary Islamic legal sources (Qur'an and Sunnah) alongside classical and modern political theory literature.

The comparative analysis reveals that while both systems share core principles such as justice (ʿAdl), mutual consultation (Shūrā), accountability (Muḥāsabah), and public welfare (Maṣlaḥah), their philosophical foundations remain distinct. Democracy grants ultimate legislative authority to the majority, whereas Islamic political theory subordinates human legislation to the normative bounds of the Sharīʿah, viewing human authority as a divine trust (Khilāfah).

The paper concludes that a synthesis is achievable through "Islamic Democracy," wherein democratic mechanisms (e.g., elections, institutional

checks, and public participation) are integrated within the ethical and legal boundaries of Islamic jurisprudence, ensuring both material welfare and spiritual alignment.

Keywords: Accountability, Comparative Politics, Governance, Islamic Political Thought, Justice, Popular Sovereignty, Shariah, Shura.

تمہید و پس منظر:

جمہوریت(Democracy) جدید سیاسی فلسفے کا ایک مرکزی تصور ہے جس کی بنیاد عوامی حاکمیت، نمائندگی، آزادیٔ رائے اور اجتماعی فیصلہ سازی پر رکھی گئی ہے۔ مغربی دنیا میں اس نظریے کو ایک مثالی نظامِ حکومت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ تاہم جب اس کا تقابل اسلامی سیاسی و معاشرتی فکر سے کیا جاتا ہے تو کئی اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ اسلام ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے جو نہ صرف عبادات بلکہ سیاست، معیشت، معاشرت اور اخلاقیات کے اصول بھی فراہم کرتا ہے۔ مولانا عاصم عمر جمہوریت کی تعریف کرتے ہیں:

"ایک ایسا نظام جس میں حاکمیت اعلیٰ اللہ کی بجائے عوام کی ملکیت ہو(نعوذ باللہ)اور حکومت عوام کے ذریعے منتخب کی جائے، علم تقویٰ کے اعتبار سے فرق ہونے کے باوجود بھی سب کی رائے اس میں برابر ہو۔ایک ایسی حکومت جس میں عقلِ انسانی ہی نظامِ زندگی زندگی بنانے والی اور انسانوں کے لیے ضابطہ ءحیات مرتب کرنے والی ہے، اس میں وحی کا کوئی دخل نہیں۔"[1]

جمہوریت کی بنیاد اس تصور پر قائم ہے کہ اقتدار کا اصل سرچشمہ عوام ہوتے ہیں اور وہی اپنے نمائندوں کے ذریعے ریاستی امور کو چلاتے ہیں۔ اس نظام میں فرد کو اپنی رائے کے اظہار، حکمرانوں کے انتخاب اور اجتماعی فیصلوں میں شرکت کا حق حاصل ہوتا ہے جو اسے ایک فعال شہری کی حیثیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کو انسانی آزادی اور مساوات کے ضامن نظام کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جمہوریت کی روح کو اقبال نے کیا خوب واضح کیا:

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے[2]

اسلامی نقطۂ نظر سے جمہوریت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اقتدار کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جب کہ انسان کو محض اس کا خلیفہ اور نمائندہ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اسلامی نظام میں عوامی رائے کو اہمیت تو حاصل ہے مگر وہ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اس تصور کے تحت انسانی خواہشات کو مطلق اختیار حاصل نہیں ہوتا بلکہ انہیں الٰہی احکامات کے تابع رکھا جاتا ہے۔ اسلامی معاشرت میں اجتماعی زندگی کے اصول عدل، مساوات، امانت اور مشاورت پر مبنی ہیں۔ جو کسی بھی کامیاب نظامِ حکومت کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ:

"اسلام میں اللہ کی حکومت، اللہ کے قانون کے ذریعے اللہ کے جاننے والوں کے لیے"[3]

اسی لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر جمہوریت کو اسلامی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایک ایسا متوازن نظام وجود میں آسکتا ہے جو نہ صرف دنیاوی فلاح بلکہ اخلاقی اور روحانی ترقی کا بھی ذریعہ بنے۔ اسلام میں سب سے بنیادی اصول حاکمیتِ الٰہی (Sovereignty of Allah) ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ"

"حکم تو صرف اللہ کا ہے"[4]

یعنی حکم صرف اللہ کا ہے۔ اس اصول سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں حتمی اختیار اور قانون سازی کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اور انسان اسی الٰہی نظام کے تابع رہتے ہوئے اپنی اجتماعی زندگی کو ترتیب دیتا ہے۔ اس تصور کے تحت قوانین محض انسانی خواہشات یا وقتی تقاضوں کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ ایک ابدی اور اخلاقی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں جو انسان کی فلاح کو یقینی بناتے ہیں۔ اس کے برعکس جمہوریت میں حاکمیت عوام کے پاس ہوتی ہے جہاں اکثریت کی رائے کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو دونوں نظاموں کو جدا کرتا ہے، کیونکہ جمہوریت میں قانون سازی عوامی خواہشات کے مطابق تبدیل ہو سکتی ہے جبکہ اسلام میں قانون سازی شریعت کے دائرے میں محدود اور اسی کے تابع رہتی ہے۔ اسلام میں مشاورت (شوریٰ) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جو جمہوریت کے ایک اہم اصول سے مشابہت رکھتی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

"وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ"

"اور ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔"[5]

اور ایک اور مقام پر نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا:

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ "

"اور کاموں میں ان سے مشورہ لو"[6]

یہ آیات اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ اسلامی نظام میں اجتماعی معاملات باہمی مشورے سے طے کیے جاتے ہیں۔ اسلام فردِ واحد کی آمریت کے بجائے اجتماعی دانش کو اہمیت دیتاہ۔ جس کے ذریعے فیصلے زیادہ متوازن اور بہتر بنائے جاسکتے ہیں۔ اسی اصولِ شوریٰ کے تحت معاشرتی اور سیاسی امور میں لوگوں کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی عملی زندگی میں اس اصول کو بارہا اختیار کیا۔

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکی دور سے ہی مسلمانوں سے اکثر مشورہ کیا کرتے تھے۔"[7]

غزوۂ بدر، احد اور خندق جیسے اہم مواقع پر آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا اور اجتماعی رائے کو اہمیت دی۔ اس طرزِ عمل سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام ایک مشاورتی نظام کو فروغ دیتا ہے جو کئی پہلوؤں سے جمہوری اقدار کے قریب تر دکھائی دیتا ہے۔ اسلامی سیاست میں ایک اور اہم اصول عدل وانصاف ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ"

بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔[8]

عدل اسلامی نظام کی بنیاد ہے اور کسی بھی ریاستی یا حکومتی نظام کی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک اس میں انصاف کو بنیادی حیثیت حاصل نہ ہو۔ اسلام میں عدل کو محض ایک اخلاقی قدر نہیں بلکہ ایک عملی اصول کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو معاشرے کے ہر طبقے پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں قانون کی بالادستی اور انصاف کی فراہمی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔

جمہوریت بھی اپنے نظریاتی ڈھانچے میں مساوات اور انصاف کی داعی ہے لیکن عملی سطح پر بعض اوقات یہ نظام اکثریت کی آمریت (Majority Tyranny) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اکثریتی طبقہ اپنے مفادات کو ترجیح دیتا ہے جس کے نتیجے میں اقلیتوں کے حقوق متاثر ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح جمہوری نظام کا بنیادی مقصد، یعنی مساوی حقوق کی فراہمی، کمزور پڑ جاتا ہے:

> "جمہوریت کا نظام سلطنت انسانی کو ایسی آزاد روش پر ڈالنا اور قدر بے وقوف بنا دیا جاتا ہے
> کہ انسان زیادہ دیر تک رب شناسی اور اللہ پرستی کے خیالات دیر تک قائم نہیں کر سکتا
> خالص جمہوری نظام سب سے زیادہ قوی تحریک دہریت اور لامذہب ہے۔"[9]

اسلام اس مسئلے کا متوازن حل پیش کرتا ہے جہاں اکثریت اور اقلیت دونوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنایا جاتا ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق کسی بھی طبقے کے ساتھ ناانصافی کی اجازت نہیں دی جاتی چاہے وہ اکثریت ہو یا اقلیت۔ اس طرح اسلامی نظام نہ صرف عدل کو قائم رکھتا ہے بلکہ معاشرتی ہم آہنگی اور پائیدار انصاف کو بھی فروغ دیتا ہے۔ اسلامی معاشرت میں جواب دہی (Accountability) کا تصور بھی بہت مضبوط ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ"
> "آگاہ ہو جاؤ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں
> سوال کیا جائے گا۔"[10]

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اسلامی نظام میں ہر فرد، خواہ وہ حکمران ہو یا عام شہری، اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے اللہ کے حضور جواب دہ ہے۔ اس تصورِ جواب دہی کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں کوئی بھی شخص اپنے فرائض سے غفلت نہ برتے اور ہر سطح پر انصاف اور دیانت کو یقینی بنایا جائے۔ اس طرح اسلامی تعلیمات فرد اور ریاست دونوں کو ایک مضبوط اخلاقی و قانونی ڈھانچے میں باندھ دیتی ہیں۔

اسلامی خلافت کے دور میں خلفائے راشدینؓ نے اس اصولِ جواب دہی کو نہ صرف نظریاتی طور پر قبول کیا بلکہ عملی طور پر بھی نافذ کیا۔ ان کی حکمرانی میں حکمران اور عوام کے درمیان ذمہ داری کا ایک واضح نظام موجود تھا جس میں ہر شخص اپنے اعمال کا جواب دہ تھا۔ اس طرزِ حکمرانی نے ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھی جہاں عدل، شفافیت اور عوامی فلاح کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت عمرؓ کا یہ مشہور قول کہ:

> "اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمر اس کا ذمہ دار
> ہو گا"[11]

اسی اعلیٰ درجے کی احساسِ ذمہ داری اور جواب دہی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ فکر اس بات کی علامت ہے کہ اسلامی نظام میں حکمران اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ طرزِ حکمرانی محض جمہوری تصورات سے نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی لحاظ سے بھی زیادہ مؤثر اور جامع سمجھا جاتا ہے۔

اسلامی سیاسی فکر میں قیادت (Leadership) کا تصور نہایت اہم اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام میں حکمران کو محض اقتدار کا مالک نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے ایک امانت دار اور قوم کا خادم قرار دیا جاتا ہے جس کی اصل ذمہ داری عوام کی خدمت، انصاف کی فراہمی اور معاشرتی فلاح کو یقینی بنانا ہے۔ اس تصور کے مطابق حکمرانی ایک اعزاز نہیں بلکہ ایک بھاری ذمہ داری ہے جس کا حساب قیامت کے دن دینا ہو گا۔ اس لیے اسلامی نظامِ سیاست میں قیادت کو ذاتی مفاد کے بجائے اجتماعی بھلائی اور عدل و انصاف کے اصولوں پر استوار کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"حَدَّثَنَا شَيْبَانُ بْنُ فَرُّوخَ ، حَدَّثَنَا أَبُو الْأَشْهَبِ ، عَنِ الْحَسَنِ ، قَالَ: عَادَ عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ زِيَادٍ مَعْقِلَ بْنَ يَسَارٍ الْمُزَنِيَّ فِي مَرَضِهِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ، قَالَ مَعْقِلٌ :إِنِّي مُحَدِّثُكَ حَدِيثًا سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَوْ عَلِمْتُ أَنَّ لِي حَيَاةً مَا حَدَّثْتُكَ، إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: " مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ، رَعِيَّةً يَمُوتُ، يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ، إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ ۔"

"ابو اشہب نے حسن (بصری) سے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا: عبید اللہ بن زیاد نے حضرت معقل بن یسار مزنی رضی اللہ عنہ کے مرض الموت میں ان کی عیادت کی تو معقل رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: میں تمہیں ایک حدیث سنانے لگا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی۔ اگر میں جانتا کہ میں ابھی اور زندہ رہوں گا تو تمہیں یہ حدیث نہ سناتا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا" : کوئی ایسا بندہ جسے اللہ کسی رعایا کا نگران بناتا ہے اور مرنے کے دن وہ اس حالت میں مرتا ہے کہ اپنی رعیت سے دھوکا کرنے والا ہے تو اللہ اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔"[12]

یہ حدیث اس بات کی واضح نشاندہی کرتی ہے کہ حکمرانی کوئی محض اعزاز یا اختیار نہیں بلکہ ایک بڑی اور بھاری ذمہ داری ہے۔ اس منصب پر فائز شخص پر لازم ہے کہ وہ دیانت، امانت اور انصاف کو ہر حال میں مقدم رکھے اور اپنے فیصلوں میں کسی ذاتی مفاد یا تعصب کو شامل نہ کرے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق حکمران اپنے عوام کے ہر معاملے کا ذمہ دار ہوتا ہے اس لیے اسے ہر قدم نہایت احتیاط، شفافیت اور عدل کے ساتھ اٹھانا چاہیے تاکہ معاشرے میں اعتماد اور انصاف قائم رہ سکے۔ اسلامی مفکرین نے بھی جمہوریت اور اسلامی نظام کے تعلق پر گہرے مباحث پیش کیے ہیں۔ امام ابو حامد الغزالیؒ کے نزدیک ریاست کا مقصد دین کی حفاظت اور دنیاوی نظام کی درستگی ہے۔ اسی طرح ابن تیمیہؒ نے اس بات پر زور دیا کہ ایک عادل غیر مسلم حکمران، ایک ظالم مسلمان حکمران سے بہتر ہو سکتا ہے کیونکہ عدل ہی ریاست کی بقا کا ضامن ہے۔ جدید دور کے مفکرین جیسے علامہ اقبالؒ نے جمہوریت کو اسلام کے قریب قرار دیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ اسلامی اصولوں کے تابع ہو۔

معاشرتی سطح پر اسلام ایک ایسا جامع نظام پیش کرتا ہے جو اخلاقی اقدار، مساوات اور بھائی چارے پر مبنی ہے۔ اس نظام میں ہر فرد کو عزتِ نفس اور بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں جب کہ معاشرے کے تمام افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی، تعاون اور ہمدردی کا درس دیا جاتا ہے۔ اسلامی معاشرت کا مقصد ایک ایسا پر امن اور منصفانہ ماحول قائم کرنا ہے جس میں ہر شخص سکون اور تحفظ کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ جمہوریت میں فرد کی آزادی کو ایک بنیادی قدر کے طور پر بہت اہمیت دی جاتی ہے تاہم عملی طور پر بعض اوقات یہ آزادی بے لگام ہو کر اخلاقی حدود سے تجاوز کر جاتی ہے۔ جب آزادی کا استعمال بغیر کسی اخلاقی یا سماجی ضابطے کے کیا جائے تو اس کے نتیجے میں معاشرتی انتشار اور عدم توازن پیدا ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح صرف آزادی پر مبنی نظام بعض اوقات اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اسلام اس آزادی کو ذمہ داری کے ساتھ جوڑتا ہے تاکہ فرد اپنی آزادی کو دوسروں کے حقوق متاثر کیے بغیر استعمال کرے۔ اس کے نتیجے میں ایک متوازن معاشرہ تشکیل پاتا ہے جہاں حقوق اور فرائض دونوں میں ہم آہنگی موجود ہوتی ہے۔ یہی توازن اسلامی معاشرت کو ایک پائیدار، منظم اور اخلاقی طور پر مضبوط نظام بناتا ہے۔ جدید دنیا میں بعض مسلم ممالک نے جمہوریت کو اپنانے کی کوشش کی ہے مگر اکثر جگہوں پر یہ تجربہ مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت کو اس کے اصل اصولوں کے مطابق نافذ نہیں کیا گیا یا اسے اسلامی اقدار سے ہم آہنگ نہیں کیا گیا۔ ایک مؤثر اسلامی جمہوری نظام وہی ہو سکتا ہے جو شریعت، عدل، مشاورت اور اخلاقی اقدار کو یکجا کرے۔ اسلام اور جمہوریت میں مکمل تضاد نہیں بلکہ ایک اصولی فرق موجود ہے۔ اسلام جمہوریت کے کئی اصولوں جیسے مشاورت، جواب دہی اور عوامی فلاح کو تسلیم کرتا ہے مگر انہیں حاکمیتِ الٰہی کے تابع رکھتا ہے۔ ایک ایسا نظام جو ان دونوں پہلوؤں کو متوازن انداز میں یکجا کرے، وہی ایک مثالی اسلامی سیاسی و معاشرتی نظام کہلا سکتا ہے جو نہ صرف دنیاوی کامیابی بلکہ اخروی فلاح کا بھی ضامن ہو۔ مشورہ اور جمہوریت کا فرق مولانا عاصم عمر کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "اسلام میں مشورہ ایک رائے ہوتی ہے۔ اس کو تسلیم بھی کیا جا سکتا ہے اور رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ جمہوریت میں جو ووٹنگ کی جاتی ہے اس میں اکثریت کی رائے کو رد نہیں کیا جا سکتا۔"[13]

اس طرح ہم دنیا میں دیکھتے ہیں تو ہمیں مغربی تہذیب اور اس کے سیاسی و سماجی نظریات خصوصاً جمہوریت، قومی ریاست اور سیکولرازم نے مسلم دنیا کی فکری، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی ساخت پر کس طرح اثرات مرتب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس تناظر میں اسلامی سیاست و معاشرت کے اصولوں اور مغربی جمہوری فکر کے تقابلی اثرات کو مختلف جہات سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسلمانوں میں مغربی تہذیب کے اثرات کا جائزہ:

مغربی تہذیب نے گزشتہ دو صدیوں میں پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ سائنسی ترقی، صنعتی انقلاب اور استعماری قوتوں کی بدولت یہ تہذیب مشرقی معاشروں، خصوصاً مسلم دنیا تک پہنچی اور رفتہ رفتہ ان کی فکری و عملی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کرنے لگی۔ اس عمل کے دوران مغرب نہ صرف ایک طاقت کے طور پر ابھرا بلکہ ایک فکری اور تہذیبی ماڈل کے طور پر بھی دنیا کے مختلف خطوں میں قبول کیا جانے لگا جس نے روایتی معاشرتی ڈھانچوں کو بتدریج تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

مسلمانوں نے جہاں مغرب کی سائنسی و تعلیمی کامیابیوں کو اپنایا وہیں ان کی معاشرت اور فکر پر بھی مغربی رنگ جھلکنے لگا۔ اس اثر پذیری کے نتیجے میں مسلم معاشروں میں ایک ایسا فکری امتزاج پیدا ہوا جس میں روایتی دینی اقدار اور جدید مغربی تصورات ایک

ساتھ موجود تھے۔ مسلمان معاشروں میں مغربی تہذیب کے اثرات بہت گہرے اور کثیر الجہتی رہے ہیں، جنہوں نے سماجی رویوں، طرزِ فکر اور معاشرتی ترجیحات کو نئی سمت دی۔ اس تبدیلی نے بعض جگہوں پر ترقی کے دروازے کھولے، لیکن ساتھ ہی شناخت اور اقدار کے بحران کو بھی جنم دیا۔

ان اثرات نے نہ صرف معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے کو متاثر کیا بلکہ تعلیمی، فکری اور اخلاقی پہلوؤں پر بھی نمایاں اثر ڈالا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جب یورپی طاقتوں نے مسلم ممالک پر قبضہ جمانا شروع کیا تو سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ مغربی طرزِ زندگی، تعلیم اور معاشرتی اقدار بھی متعارف کرائیں گئیں۔ اس دوران مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی نے مسلمانوں میں اپنی پسماندگی کا احساس پیدا کیا جس سے فکری اور روحانی اعتبار سے ان میں کمزوری پیدا ہوئی۔ یہ احساسِ کمتری بعض اوقات مغربی تہذیب کی غیر تنقیدی تقلید کا سبب بھی بنا جس نے مسلم معاشروں کے فکری توازن کو متاثر کیا اور ان کے اندر اپنی تہذیبی بنیادوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت کو مزید اجاگر کیا۔ مولانا مودودیؒ نے بھی اس سلسلے میں فرمایا:

> "سائنسی ترقی نے مسلمانوں میں مادیت پسندی اور روحانی کمزوری کو فروغ دیا، جبکہ دینی تربیت اور اخلاقی اقدار پسماندہ رہ گئیں۔"[14]

تعلیمی نظام میں مغربی نصاب کی نفوذ نے دینی علوم کو تدریجاً ثانوی حیثیت دے دی اور جدید سائنسی و فنی مضامین کو مرکزی اہمیت حاصل ہونے لگی۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں مدارس اور روایتی دینی اداروں کی علمی حیثیت نسبتاً کمزور پڑنے لگی، جب کہ جدید تعلیمی ادارے معاشرتی ترقی اور روزگار کے بنیادی مراکز کے طور پر سامنے آئے۔ اس صورتحال نے علمی ترجیحات کو بدل دیا اور علم کے معیار کو زیادہ تر مغربی تعلیمی ماڈلز کے مطابق ڈھال دیا گیا۔ اس اثر کے نتیجے میں مسلم نوجوان نسل مغربی سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی سے مرعوب ہو گئی جس سے ان کے فکری رجحانات میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی۔ سائنسی ترقی اور مادی کامیابیوں کو ہی اصل معیار سمجھا جانے لگا جس کے باعث مادہ پرستی کے رجحانات میں اضافہ ہوا۔ رفتہ رفتہ علم کا مقصد محض معاشی ترقی اور دنیاوی کامیابی تک محدود ہوتا چلا گیا جبکہ روحانی اور اخلاقی تربیت کی اہمیت کمزور پڑتی گئی۔

اسی دوران سیکولر فلسفہ بھی مسلم معاشروں میں داخل ہوا جس نے مذہب کو فرد کی نجی زندگی تک محدود کرنے کا تصور عام کیا۔ اس فکر کے تحت سیاست، معیشت اور قانون جیسے اجتماعی شعبوں کو دین سے الگ سمجھا جانے لگا اور ریاستی نظام کو مذہبی رہنمائی سے آزاد کرنے کا رجحان فروغ پایا۔ اس فکری تبدیلی نے اسلامی تہذیبی ڈھانچے پر گہرا اثر ڈالا اور دین و دنیا کے درمیان ایک واضح تفریق کو جنم دیا جس کے اثرات آج بھی مختلف مسلم معاشروں میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس ضمن میں لکھا:

> "مسلمانوں نے مغرب کی سائنسی ترقی کو دیکھ کر اپنی قدیم علوم کی قدر کو کم تر جانا اور مغرب کے افکار سے متاثر ہو کر اپنی فکری بنیادیں ہلا دیں۔"[15]

ثقافتی اور معاشرتی اثرات بھی مسلم دنیا میں نمایاں طور پر ظاہر ہوئے۔ مغربی طرزِ زندگی، لباس، ادب، زبان اور میڈیا نے مسلمانوں کی فکری اور معاشرتی اقدار کو گہرے طور پر متاثر کیا اور ایک نئی تہذیبی کشمکش کو جنم دیا۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں روایتی اسلامی معاشرتی شناخت اور جدید مغربی رجحانات کے درمیان ایک مسلسل تعامل اور تصادم کی کیفیت پیدا ہوئی جس نے معاشرتی رویوں کو ازسرِ نو تشکیل دینا شروع کیا۔ اخبارات، رسائل، تھیٹر اور بعد ازاں فلم و ریڈیو جیسے ذرائع ابلاغ نے مغربی تصورات کو بڑے پیمانے پر عام کیا۔

ان ذرائع نے نہ صرف معلومات کی ترسیل کے انداز کو بدلا بلکہ لوگوں کی سوچ، ترجیحات اور اخلاقی معیار پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اس کے نتیجے میں مغربی اخلاقی و تہذیبی معیارات کی پذیرائی میں اضافہ ہوا اور کئی معاشرتی اقدار بتدریج تبدیل ہونے لگیں جس سے مقامی اور روایتی اقدار کی جگہ نئے تصورات نے لیناشروع کر دی۔

اسی پس منظر میں خواتین کے حقوق اور آزادی کے نام پر بھی مغربی اقدار کو فروغ دیا گیا جس نے اسلامی معاشرتی ڈھانچے اور خاندانی نظام پر واضح دباؤ ڈالا۔ خاندان کے ادارے، جو اسلامی معاشرت کی بنیادی اکائی سمجھے جاتے تھے ان تبدیلیوں سے متاثر ہونے لگے۔ ان حالات میں اسلامی مفکرین نے ان اثرات کا گہرائی سے تجزیہ کرتے ہوئے دفاعی اور اصلاحی رویہ اختیار کیا اور اسلامی تعلیمات، وحی اور دینی اصولوں کی افادیت کو اجاگر کرنے کی مسلسل کوشش کی تاکہ معاشرتی توازن اور شناخت کو برقرار رکھا جاسکے۔

سیاسی اثرات:

مغربی تہذیب نے مسلمانوں کے سیاسی نظام پر گہرے اور دور رس اثرات ڈالے۔ جمہوریت، قومی ریاست (Nation State) اور سیکولر سیاست جیسے نظریات بتدریج مسلم ممالک میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ ریاستی وسیاسی ڈھانچوں کا حصہ بننے لگے۔ مسلمان معاشروں میں مغربی تہذیب کے سیاسی اثرات انتہائی گہرے اور پائیدار رہے جنھوں نے روایتی سیاسی تصورات کو نئے فکری چیلنجز سے دوچار کیا۔ یورپی طاقتوں کے استعماری غلبے نے ان نظریات کو محض فکری سطح تک محدود نہیں رکھا بلکہ عملی نظامِ حکومت میں بھی ان کا نفوذ ممکن بنایا۔ اسلامی نظام میں حکمرانی بنیادی طور پر اللہ کی رضا اور شریعت کی بنیاد پر ہوتی تھی جہاں اقتدار کو ایک امانت سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس مغربی ماڈل میں اقتدار کو عوامی رائے، شہری حقوق اور قانونی جمہوریت کے اصولوں پر منحصر قرار دیا گیا۔ اس فکری تبدیلی نے مسلمانوں کی روایتی سیاسی اور قانونی اقدار پر گہرا اثر ڈالا اور خلافت کے تاریخی تصور کو ایک بڑے فکری چیلنج سے دوچار کر دیا جس کے نتیجے میں سیاسی فکر میں ایک واضح تقسیم پیدا ہوئی۔

روایتی اسلامی حکمرانی میں حکمران کا کردار اخلاقی، مذہبی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے منسلک تھا، جبکہ مغربی ماڈل نے اقتدار کو زیادہ تر سیاسی اور قانونی دائرے تک محدود کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں حکومتی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں آئیں، روایتی قیادت کمزور پڑ گئی اور جدید نظریات کے تحت نئے ادارے قائم ہونے لگے۔ قومی ریاست کی تشکیل نے فرقہ وارانہ اور علاقائی شناختوں کو مزید تقویت دی جس سے بعض مقامات پر سیاسی انتشار اور اندرونی خلفشار پیدا ہوا۔ اسی طرح سیکولر سیاست نے مذہب کو عوامی زندگی اور حکومتی معاملات سے الگ کر دیا جس کے نتیجے میں اسلامی سیاسی فلسفہ متاثر ہوا اور دین وسیاست کے درمیان فاصلہ مزید بڑھ گیا۔ علامہ اقبال اس معاملے پر لکھتے ہیں:

> "مسلمان جدید یورپی سیاسی نظریات کی تقلید میں اپنی تاریخی اور دینی شناخت سے دور ہو گئے۔"[16]

سید ابو الاعلیٰ مودودی نے بھی اس بات پر زور دیا کہ مغربی سیاست کا سب سے بڑا اثر یہ قرار دیا جاتا ہے کہ اس نے دین اور سیاست کے باہمی ربط کو کمزور کر دیا اور ان دونوں کو الگ الگ دائروں میں تقسیم کر دیا۔ اس فکری تبدیلی کے نتیجے میں مسلم معاشروں میں ایسے نظریات فروغ پانے لگے جن میں مذہب کو اجتماعی نظم ونسق اور ریاستی معاملات سے خارج تصور کیا جانے لگا۔ اس تقسیم نے اسلامی تہذیب کے اس بنیادی تصور کو متاثر کیا جس میں دین کو زندگی کے ہر شعبے کے لیے رہنما اصول سمجھا جاتا ہے۔ اس صورتحال کے اثرات یہ سامنے آئے کہ بعض مسلم معاشروں میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جو دین کو زیادہ تر فرد کی نجی زندگی تک محدود دیکھنے کا

خواہاں تھا۔ اس رجحان نے مذہب کی اجتماعی حیثیت کو کمزور کیا اور سیاست، قانون اور معیشت جیسے اہم شعبوں کو مذہبی اصولوں سے الگ کرنے کے تصورات کو تقویت دی۔ نتیجتاً ایک فکری فاصلے نے جنم لیا جس نے روایتی اسلامی سیاسی فکر کو نئے چیلنجز سے دوچار کیا۔

اس فکری تقسیم نے مسلم دنیا میں ایک مستقل مباحثے کو جنم دیا جس میں دین اور ریاست کے تعلق کو مختلف زاویوں سے سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک طرف وہ فکر سامنے آئی جو اسلامی نظام کو مکمل اور ہمہ گیر سمجھتی ہے جب کہ دوسری طرف جدید مغربی سیاسی تصورات سے متاثرہ نقطۂ نظر بھی موجود رہا۔ اس کشمکش نے نہ صرف نظریاتی سطح پر بحث کو بڑھایا بلکہ عملی سیاست اور ریاستی ڈھانچے کی تشکیل پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> "مغربی سیاست کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ اس نے دین اور سیاست کو الگ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمان ممالک میں بھی ایک طبقہ پیدا ہوا جو اسلام کو محض ذاتی زندگی تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔"[17]

مسلم معاشروں میں مغربی سیاسی تصورات کے اثرات صرف ادارہ جاتی ڈھانچوں تک محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے مجموعی سیاسی سوچ اور فکری رویوں پر بھی گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں ریاست، اقتدار اور قانون کے بارے میں روایتی اسلامی تصورات کی جگہ نئے فکری زاویے سامنے آنے لگے جن میں مغربی ماڈل کو زیادہ عملی اور مؤثر سمجھا جانے لگا۔ اس فکری تبدیلی نے سیاسی شعور کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا جس میں مذہبی اصولوں کی بجائے جدید ریاستی نظریات کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔

اسی تسلسل میں نئے سیاسی ادارے آئین سازی کے عمل اور قانونی ڈھانچے مغربی نمونوں کے مطابق تشکیل پانے لگے۔ ان تبدیلیوں نے بعض مسلم ممالک میں روایتی اسلامی عدلیہ اور فقہی نظام کو پس پشت ڈال دیا یا اس کی حیثیت کو محدود کر دیا۔ اس کے نتیجے میں قانون سازی اور عدالتی نظام میں ایک ایسا دوہراپن پیدا ہوا جس میں جدید ریاستی قوانین اور روایتی دینی اصول ایک ساتھ موجود تو رہے مگر ان کے درمیان عملی ہم آہنگی کمزور پڑ گئی۔

اس کے ساتھ ہی سیاسی آزادی کے نئے تصورات نے معاشرتی تقسیم اور فرقہ وارانہ رجحانات کو بھی جنم دیا۔ جب قومیت اور ریاست کی تعریف مذہبی اصولوں کے بجائے لسانی، جغرافیائی اور قومی بنیادوں پر استوار کی جانے لگی تو معاشروں میں نئی شناختیں ابھرنے لگیں۔ اس تبدیلی نے بعض مقامات پر باہمی اتحاد کے بجائے اختلافات کو بڑھایا، جس کے نتیجے میں سیاسی اور سماجی سطح پر پیچیدگیاں اور داخلی تقسیم کے رجحانات مزید نمایاں ہو گئے۔

تعلیمی اثرات:

مغربی تہذیب نے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم میں بنیادی اور دوررس تبدیلیاں پیدا کیں جن کے اثرات آج تک محسوس کیے جا رہے ہیں۔ انگریزی اداروں، جدید تعلیمی مراکز اور مغربی طرز کے نصاب نے نئی نسل کی فکری بنیادوں کو تبدیل کر دیا اور علم کے حصول کے روایتی انداز کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ اس عمل نے تعلیم کو محض معلومات کے بجائے ایک نئے فکری اور تہذیبی رجحان کا ذریعہ بنا دیا جس کے ذریعے طلبہ کی سوچ اور ترجیحات بھی بدلنے لگیں۔ مسلمان معاشروں میں مغربی تہذیب نے تعلیمی شعبے کے ذریعے نہ صرف سیاسی اور معاشرتی اثرات مرتب کیے بلکہ فکری بنیادوں کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا۔ مغربی نصاب اور اداروں نے

تدریجاً مدارس اور روایتی دینی تعلیم کی جگہ لینا شروع کی جس سے تعلیمی نظام میں ایک واضح تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں دینی علوم کی حیثیت ثانوی ہوتی گئی جبکہ جدید سائنسی، لسانی اور تاریخی مضامین کو مرکزی مقام حاصل ہو گیا۔

اس تعلیمی تبدیلی نے نئی نسل کی فکری ترجیحات اور علم کے معیار کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا اور مغربی طرزِ فکر کو بنیادی تعلیمی اصول کے طور پر قبول کیا جانے لگا۔ اس کے نتیجے میں تعلیم کا مقصد صرف روزگار یا مہارت کا حصول رہ گیا، جبکہ اخلاقی اور روحانی تربیت کی اہمیت نسبتاً کمزور پڑ گئی۔ یوں تعلیمی نظام ایک ایسے فکری رخ پر گامزن ہوا جس نے مسلم معاشروں کی علمی و تہذیبی سمت کو بھی متاثر کیا۔۔ شبلی نعمانی اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہیں:

"ہمارے مدارس میں جو تعلیم دی جاتی تھی وہ ہماری تہذیب کی روح سے ہم آہنگ تھی،
مگر انگریزی تعلیم نے ایک نئی ذہنیت پیدا کر دی جو اپنی جڑوں سے کٹتی چلی گئی۔"[18]

ابتدائی تعلیم میں مغربی فلسفہ، سائنس اور تاریخ کے مضامین کو شامل کیے جانے سے تعلیمی ڈھانچے میں ایک واضح فکری تبدیلی واقع ہوئی جس کے نتیجے میں اسلامی علوم اور اخلاقی تربیت کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ نصاب کی اس تبدیلی نے علم کے توازن کو متاثر کیا جہاں روحانی اور اخلاقی پہلو نسبتاً کم اہمیت اختیار کرتے گئے اور جدید سائنسی و نظریاتی مضامین کو زیادہ مرکزیت حاصل ہو گئی۔ اس صورتحال نے تعلیمی عمل کو ایک ایسے رخ پر ڈال دیا جس میں فکری تشکیل زیادہ تر مغربی ماڈلز کے مطابق ہونے لگی۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے تعلیمی اثرات نے طلبہ کی علمی مہارت اور اظہار کی صلاحیت کو ایک نئے دائرے میں داخل کیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں مغربی ثقافت اور تہذیبی اقدار کے قریب بھی کر دیا۔ زبان صرف ابلاغ کا ذریعہ نہ رہی بلکہ ایک تہذیبی اثر پذیری کا وسیلہ بن گئی، جس کے ذریعے مغربی طرزِ فکر اور طرزِ زندگی طلبہ کے ذہنوں میں سرایت کرنے لگا۔ اس عمل نے تعلیمی ماحول کو بتدریج ایک دوہری شناخت میں تبدیل کر دیا۔

اس کے نتیجے میں نوجوان نسل میں احساسِ کمتری پیدا ہوا اور مغربی ترقی کو مسلم معاشروں کے لیے ایک مثالی ماڈل کے طور پر دیکھنے کا رجحان بڑھنے لگا۔ اپنی علمی اور تہذیبی روایت کے مقابلے میں مغربی کامیابیوں کو زیادہ برتر سمجھنے کا تصور عام ہوا جس نے فکری اعتماد کو متاثر کیا۔ یوں تعلیمی اثرات صرف نصاب تک محدود نہ رہے بلکہ انہوں نے مجموعی ذہنی ساخت اور تہذیبی ترجیحات کو بھی گہرے طور پر بدل دیا۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ:

"مغربی نصاب نے اسلامی تعلیم کو ثانوی حیثیت دے کر نئی نسل کی فکری بنیادیں تبدیل
کر دی ہیں۔"[19]

مسلمانوں کے نظامِ تعلیم میں مغربی نصاب اور اداروں کی اجارہ داری نے تدریجاً تعلیمی ترجیحات کو بدل دیا اور نوجوانوں کی دینی تربیت کے دائرے کو محدود کر دیا۔ روایتی دینی علوم، اخلاقی تربیت اور روحانی تشکیل کی جگہ جدید تعلیمی ڈھانچے نے لے لی، جس میں زیادہ زور سائنسی مہارتوں اور عملی علوم پر دیا جانے لگا۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں تعلیمی نظام ایک نئے فکری سانچے میں ڈھل گیا، جہاں نصاب کی سمت اور مقاصد بھی مغربی تعلیمی ماڈلز کے مطابق تشکیل پانے لگے۔ اس تعلیمی تبدیلی کے اثر سے نوجوان نسل بڑی حد تک مغربی افکار و نظریات کے تابع ہوتی چلی گئی۔ فلسفہ، سماجی علوم اور جدید نظریات کے مطالعے نے ان کے فکری زاویے کو وسعت تو دی، لیکن ساتھ ہی مقامی دینی و تہذیبی بنیادوں سے ایک فاصلہ بھی پیدا کر دیا۔ یوں فکری تشکیل میں ایک ایسا رجحان ابھرا جس میں مغربی علمی روایت کو زیادہ معتبر اور حتمی معیار سمجھا جانے لگا۔

اس پورے عمل نے اگرچہ علمی آزادی اور جدید تحقیق کے میدان میں ایک ظاہری ترقی پیدا کی لیکن اس کے ساتھ اسلامی شناخت اور اخلاقی بنیادوں پر گہرا اثر بھی مرتب ہوا۔ تعلیم کا مقصد محض پیشہ ورانہ مہارت تک محدود ہونے لگا جب کہ کردار سازی اور دینی شعور نسبتاً پس منظر میں چلا گیا۔ اس کے نتیجے میں مسلم معاشروں میں ایک ایسا فکری خلا پیدا ہوا جس نے شناخت اور اقدار کے سوالات کو مزید نمایاں کر دیا۔

معاشرتی و اخلاقی اثرات:

مغربی تہذیب نے مسلم معاشروں میں طرزِ زندگی، لباس، رہن سہن اور حتیٰ کہ خاندانی اقدار تک پر اثر ڈالا۔ مغربی تہذیب نے مسلمانوں کے معاشرتی اور اخلاقی ڈھانچے پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ طرزِ زندگی میں تبدیلیاں سب سے پہلے شہروں میں نظر آئیں جہاں مغربی لباس، تہذیبی رسومات اور عوامی برتاؤ کے معیار رائج ہونے لگے۔ گھریلو اور خاندانی اقدار بھی متاثر ہوئیں مغربی ثقافت میں فرد کی آزادی کو ترجیح دی جاتی تھی جس نے اسلامی معاشرتی نظام میں والدین اور بزرگوں کے کردار کو محدود کر دیا۔ نوجوان نسل مغربی تہذیب کی عادات و اطوار سے متاثر ہو کر اپنی دینی اور اخلاقی تربیت کو پس پشت ڈالنے لگی:

"مسلمان معاشرے میں آج مغربی اندازِ حیات اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ شادی بیاہ، تقریبات اور روزمرہ زندگی میں اسلامی سادگی کے بجائے نمود و نمائش نمایاں ہے۔"[20]

لباس و رہن سہن میں یورپی طرزِ زندگی کو اپنانے کے رجحان نے مسلم معاشروں کے اندر سماجی و خاندانی ڈھانچے پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں طرزِ زندگی، روزمرہ عادات اور معاشرتی رویے بتدریج مغربی سانچے میں ڈھلنے لگے جس سے روایتی اسلامی معاشرتی اقدار اور جدید رجحانات کے درمیان ایک واضح فرق پیدا ہوا۔ اس اثر پذیری نے معاشرتی تبدیلی کے عمل کو مزید تیز کر دیا اور پرانی تہذیبی روایات کو نئے چیلنجز سے دوچار کیا۔ اس رجحان کے نتیجے میں خواتین کی اجتماعی اور گھریلو ذمہ داریوں میں بھی واضح تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ گھر اور خاندان کے اندر جو روایتی کردار اور ذمہ داریاں تھیں، ان کی نوعیت میں بتدریج تبدیلی آنے لگی اور سماجی سرگرمیوں میں شرکت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اس عمل نے خواتین کے معاشرتی کردار کو نئے زاویوں سے متعارف کروایا، تاہم اس کے ساتھ خاندانی نظام کی روایتی ترتیب بھی متاثر ہوئی۔

اسی تسلسل میں خاندان کے رشتوں میں رسمیت اور باہمی شراکت کی جگہ خود مختاری کی اہمیت بڑھتی گئی۔ فرد کی آزادی اور ذاتی فیصلوں کو زیادہ ترجیح دی جانے لگی جس کے نتیجے میں خاندانی اکائی کے اندر باہمی انحصار کا تصور نسبتاً کمزور پڑ گیا۔ اس تبدیلی نے خاندانی نظام کے اندر ایک نئی فکری و سماجی کشمکش کو جنم دیا جس میں روایتی اقدار اور جدید رجحانات ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتے نظر آئے۔ یوسف القرضاوی بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ:

"مغربی معاشرتی اقدار نے اسلامی معاشرے میں اخلاقی زوال کو جنم دیا اور روحانی خلا پیدا کیا۔"[21]

مغربی تہذیب نے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی، اخلاقی معیار اور خاندانی ڈھانچے پر گہرے اور وسیع اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان اثرات کے نتیجے میں طرزِ زندگی، سماجی عادات اور معاشرتی رویوں میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں جنہوں نے روایتی اسلامی اقدار کو ایک نئے فکری اور تہذیبی تناظر سے دوچار کیا۔ روزمرہ معمولات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اخلاقی معیار بھی مختلف اثرات قبول کرنے

لگا جس سے معاشرتی رویوں میں تنوع اور بعض جگہوں پر تضاد پیدا ہوا۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں نہ صرف مذہبی شعور متاثر ہوا بلکہ معاشرتی ہم آہنگی میں بھی واضح کمی محسوس کی گئی۔ جب مختلف فکری اور تہذیبی رجحانات ایک ہی معاشرے میں ساتھ ساتھ پروان چڑھنے لگے تو اجتماعی یکسانیت اور فکری ہم آہنگی کمزور پڑ گئی۔ اس صورتحال نے معاشرتی سطح پر ایک ایسی کیفیت کو جنم دیا جس میں روایتی اقدار اور جدید اثرات کے درمیان توازن قائم رکھنا ایک اہم فکری اور سماجی چیلنج بن گیا۔

فکری و فلاحی اثرات:

مسلم دنیا میں مغربی فکر نے سائنس، ٹیکنالوجی اور تنظیمی شعور کو اجاگر کیا جو ایک مثبت پہلو ہے۔ مسلم دنیا میں مغربی فکر نے فکری و فلاحی شعبوں پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ سب سے پہلے سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں مغربی تحقیق و ایجادات نے مسلمانوں کو جدید علوم سے روشناس کیا۔ صنعتی ترقی، طبی سہولیات اور مواصلاتی نظام نے معاشرتی فلاح میں بہتری پیدا کی اور لوگوں کو معاشرتی مسائل کے حل کے جدید طریقے سیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری لکھتے ہیں:

"مسلمانوں نے جب مغربی سائنس کو اپنایا تو ان کے اندر ترقی کی نئی راہیں کھلیں، لیکن جب انہوں نے مغرب کی اخلاقی اور لادینی فکر کو اپنایا تو اپنی روحانی بنیادیں کھو بیٹھے۔"[22]

تنظیمی شعور بھی مغربی فکر کے اثر سے بڑھا۔ مغربی نظم و ضبط بیوروکریسی اور انتظامی ڈھانچے نے مسلم ممالک میں حکومتی اداروں کو منظم کرنے کے اصول سکھائے۔ اس کے علاوہ جدید تعلیم نے نوجوانوں میں تنقیدی سوچ اور تجزیاتی صلاحیت پیدا کی، جس نے معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لیے بنیاد فراہم کی۔ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی بھی لکھتے ہیں کہ:

"جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے اسلامی معاشروں میں فلاحی نظام کے قیام میں کردار ادا کیا۔"[23]

اس طرح مغربی فکر کے فلاحی پہلو نے مسلم دنیا کو ترقی اور جدیدیت کی طرف راغب کیا بشرطیکہ اسے اپنی دینی اور اخلاقی بنیادوں کے ساتھ ہم آہنگ رکھا جائے۔

مذہبی رویّے پر اثرات:

مغربی فکر نے بعض طبقات میں الحاد، مادہ پرستی اور سیکولرازم کو فروغ دیا جبکہ دوسری طرف ایک دینی بیداری بھی پیدا ہوئی۔ مغربی فکر کے اثرات مسلمانوں کے مذہبی رویّے پر انتہائی پیچیدہ اور متنوع رہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جب یورپی طاقتوں نے مسلم ممالک میں سیاسی اور معاشرتی تسلط قائم کیا تو اس کے ساتھ مغربی تعلیمی ادارے، نصاب اور تہذیبی اقدار بھی مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئیں۔

اس کے نتیجے میں دو طرح کے اثرات واضح ہوئے۔ پہلا اثر الحاد، مادہ پرستی اور سیکولرازم کی صورت میں سامنے آیا۔ جدید سائنس اور صنعتی ترقی نے فطرت اور کائنات کے مادی قوانین کو اجاگر کیا اور انگریزی و فرانسیسی نصابوں نے مذہب کو صرف نجی زندگی کے دائرے میں محدود کر دیا۔ اس نے کئی نوجوان مسلمانوں میں احساس کمتری اور روحانی خلا پیدا کیا۔ یوسف القرضاوی کے بقول:

"جدید فکر اور مغربی تہذیب نے بعض مسلمانوں میں دین سے فاصلے پیدا کیے اور عقائد میں لچک پیدا کی۔"[24]

اس کا مطلب یہ تھا کہ مذہبی احکام اور اخلاقی اصول اب زندگی کے اہم فیصلوں میں حتمی معیار نہ رہے بلکہ انسانیت اور عقلی تشخیص کو فوقیت دی گئی۔ دوسرا اثر ایک مثبت دینی بیداری کی صورت میں آیا۔ مغربی فکری دباؤ کے نتیجے میں مسلمانوں نے اپنی دینی اور علمی بنیادوں کی حفاظت کی کوشش کی۔ مدارس کی تجدید دینی کتب کی اشاعت، اور فکری حلقوں کی تشکیل نے دینی شعور کو زندہ رکھا۔ علامہ اقبال نے اس سلسلے میں فرمایا:

"اگر مسلمان اپنے ایمان اور علمی بنیادوں کو مضبوط رکھیں تو جدید علوم سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔"[25]

اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا کہ مغربی علوم اور ترقی سے استفادہ ممکن ہے لیکن اس کے لیے دینی شعور اور اخلاقی بنیادوں کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مطابق:

"مغربی فکر کے غلبے نے مسلمانوں کو ایک نئے چیلنج سے دوچار کیا اور اسی چیلنج نے اسلامی احیائی تحریکوں کو جنم دیا جو اسلام کی ہمہ گیر حیثیت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔[26]

مزید یہ کہ مغربی فکر نے مسلمانوں میں مذہبی مطالعہ اور تجزیہ کی اہمیت بڑھادی۔ الحاد اور مادہ پرستی کے چیلنج کے سامنے علما اور مفکرین نے عقلی اور نصیبی دلائل کے ذریعے وحی اور سنت کے فہم کو تقویت دی۔ ایک قسم کی فکری ہم آہنگی پیدا ہوئی جس نے اسلامی تعلیمات کو نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں مدد دی۔ اس طرح مغربی اثرات نے مذہبی رویّے کو تو چیلنج کیا مگر ساتھ ہی اسلامی فکر کی تجدید اور بیداری کا بھی سبب بنے۔ مسلمانوں پر مغربی تہذیب کے اثرات ہمہ جہتی اور پیچیدہ ہیں۔ جہاں اس نے مادی ترقی سائنس اور تنظیم کے میدان میں مثبت پہلو دیے وہیں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے منفی اثرات بھی چھوڑے۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان مغربی تہذیب کی مفید چیزوں کو اپنائیں مگر اپنی اسلامی روحانیت اور اخلاقی اساس کو ہرگز نہ چھوڑیں۔

نتائج

1۔ تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جمہوریت اور اسلامی سیاسی نظام کے بنیادی تصور میں حاکمیت کے حوالے سے واضح فرق پایا جاتا ہے، جہاں جمہوریت میں حاکمیت عوام کی جبکہ اسلام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔

2۔ اسلامی نظامِ سیاست میں مشاورت (شوریٰ)، عدل، امانت اور جواب دہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جو ایک منصفانہ اور متوازن حکومتی ڈھانچے کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

3۔ جمہوری نظام اگرچہ مساوات، آزادیٔ رائے اور نمائندگی جیسے اصولوں پر قائم ہے، تاہم عملی طور پر بعض اوقات یہ اکثریت کی بالادستی میں تبدیل ہو کر اقلیتوں کے حقوق کو متاثر کر سکتا ہے۔

4۔ اسلامی سیاسی فکر میں قیادت کو ایک امانت اور ذمہ داری سمجھا جاتا ہے، جبکہ جمہوری نظام میں قیادت زیادہ تر سیاسی اختیار اور عوامی نمائندگی کے تصور سے منسلک ہے۔

5۔ دونوں نظاموں کے تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر جمہوری اصولوں کو اسلامی اخلاقی و شرعی حدود کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے تو ایک متوازن اور مؤثر نظامِ حکومت وجود میں آ سکتا ہے۔

تجاویز

1۔ اسلامی سیاسی فکر اور جمہوری اصولوں کے تقابلی مطالعہ کو تعلیمی نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ طلبہ میں فکری توازن اور شعور پیدا ہو سکے۔

2۔ مسلم معاشروں میں ایسے نظامِ حکومت کو فروغ دیا جائے جو شوریٰ، عدل اور احتساب جیسے اسلامی اصولوں کو جدید انتظامی ڈھانچے کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔

3۔ جمہوری نظام میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کو مزید مضبوط بنانے کے لیے اخلاقی اور قانونی اصلاحات متعارف کرائی جائیں۔

4۔ سیاسی قیادت کے انتخاب اور تربیت میں دیانت، امانت اور اخلاقی معیار کو بنیادی شرط کے طور پر شامل کیا جائے تاکہ حکمرانی کا معیار بہتر ہو سکے۔

5۔ اسلامی اور مغربی سیاسی فکر کے درمیان مکالمے کو فروغ دیا جائے تاکہ دونوں نظاموں کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک متوازن سیاسی و سماجی ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکے۔

کتابیات

1۔ القرآن

2۔ جلال الدین سیوطی، علامہ، تاریخ الخلفا، نور پبلیکیشنز، دہلی، 1990ء

3۔ خالد حقانی، شیخ، جمہوریت اہل حق کی عدالت میں، ندارد، 2021ء، ص10

4۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، رنگین پریس، دہلی، 1923ء

5۔ صحیح بخاری

6۔ صحیح مسلم

7۔ عاصم عمر، مولانا، ادیان کی جنگ دینِ اسلام یا دینِ جمہوریت؟، ادارہ حطین، لاہور، 2013ء

8۔ عبدالرحمن کیلانی، مولانا، خلافت و جمہوریت، احد پرنٹنگ پریس 50 لوئر مال، لاہور، 2002ء

9۔ علی عزت بیگووچ، اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش، مترجم محمد ایوب منیر، میٹرو پرنٹرز، لاہور، 2016ء

10۔ فضل الرحمن انصاری، ڈاکٹر، اسلام اور مغربی تہذیب، مترجم ڈاکٹر حبیب الرحمٰن، سیرت ریسرچ، کراچی، 2021ء

11۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ترجمان القرآن، لاہور، 1960ء

12۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014ء

13۔ محمد اقبال، علامہ، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، 1958ء

14۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، خطباتِ بہاولپور، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، 1985ء

15۔ ندیم الواجدی، مولانا، آزادی سے جمہوریت تک، یاسر ندیم آفسیٹ پریس، دیوبند، 2017ء

16۔ نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر، اسلام کا معاشی نظام، مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی، 1971ء

17۔ یوسف القرضاوی، فقہ الزکوٰۃ، البدر پبلی کیشنز، لاہور، 2007ء

1. The Qur’an
2. Al-Suyuti, Jalal al-Din (Allama). *Tarikh al-Khulafa*. Noor Publications, Delhi, 1990.
3. Haqqani, Khalid (Sheikh). *Jamhooriyat Ahl-e-Haq Ki Adalat Mein* (Democracy in the Court of the People of Truth). Nidarad, 2021.
4. Nomani, Shibli. *Maqalat-e-Shibli*. Rangeen Press, Delhi, 1923.
5. *Sahih al-Bukhari*
6. *Sahih Muslim*
7. Umar, Asim (Maulana). *Adyan Ki Jang: Deen-e-Islam Ya Deen-e-Jamhooriyat?* (The War of Religions: Islam or Democracy?). Idara Hittin, Lahore, 2013.
8. Kilani, Abdul Rahman (Maulana). *Khilafat wa Jamhooriyat* (Caliphate and Democracy). Ahad Printing Press, 50 Lower Mall, Lahore, 2002.
9. Izetbegović, Alija. *Islam Between East and West*. Translated by Muhammad Ayub Munir. Metro Printers, Lahore, 2016.
10. Ansari, Fazlur Rahman (Dr.). *Islam and Western Civilization*. Translated by Dr. Habib-ur-Rehman. Seerat Research, Karachi, 2021.
11. Maududi, Abul A‘la (Syed). *Islamic Civilization: Its Principles and Fundamentals*. Tarjuman al-Qur’an, Lahore, 1960.
12. Iqbal, Muhammad (Allama). *Kulliyat-e-Iqbal*. Educational Publishing House, Delhi, 2014.
13. Iqbal, Muhammad (Allama). *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*. Bazm-e-Iqbal, Lahore, 1958.
14. Hamidullah, Muhammad (Dr.). *Khutbat-e-Bahawalpur*. Idara Tahqiqat-e-Islami, Islamabad, 1985.
15. Al-Wajdi, Nadeem (Maulana). *Azadi Se Jamhooriyat Tak* (From Freedom to Democracy). Yasir Nadeem Offset Press, Deoband, 2017.
16. Siddiqi, Nejatullah (Dr.). *Islamic Economic System*. Maktaba Jamaat-e-Islami Hind, Delhi, 1971.
17. Al-Qaradawi, Yusuf. *Fiqh al-Zakat*. Al-Badr Publications, Lahore, 2007.

[1] Mawlānā ʿĀṣim ʿUmar, *Adiyān kī Jang Dīn-i-Islām yā Dīn-i-Jamhūriyyat?* (Lāhore: Idārah Ḥiṭṭīn, 2013), 40.

[2] ʿAllāmah Muḥammad Iqbāl, *Kulliyyāt-i-Iqbāl* (Delhī: Educational Publishing House, 2014), 610.

[3] Mawlānā Nadīm al-Wājidī, *Āzādī se Jamhūriyyat tak* (Deoband: Yāsir Nadīm Offset Press, 2017), 126.

[4] *Al-Qur'ān*, Sūrah Yūsuf 12:40.

[5] *Al-Qur'ān*, Sūrah al-Shūrā 42:38.

[6] *Al-Qur'ān*, Sūrah Āl ʿImrān 3:159.

[7] Mawlānā ʿAbd al-Raḥmān Keilānī, *Khilāfat o Jamhūriyyat* (Lāhore: Aḥad Printing Press 50 Lower Mall, 2002), 123.

[8] *Al-Qur'ān*, Sūrah al-Naḥl 16:90.

[9] Shaykh Khālid Ḥaqqānī, *Jamhūriyyat Ahl-i-Ḥaq kī ʿAdālat mein* (Nādārad, 2021), 10.

[10] Muḥammad bin Ismāʿīl al-Bukhārī, *Ṣaḥīḥ al-Bukhārī* (Ḥadīth No. 7138).

[11] ʿAllāmah Jalāl al-Dīn al-Suyūṭī, *Tārīkh al-Khulafā'* (Delhī: Nūr Publications, 1990), 145.

[12] Muslim bin al-Ḥajjāj, *Ṣaḥīḥ Muslim* (Kitāb al-Īmān, Ḥadīth No. 363).

[13] Mawlānā ʿĀṣim ʿUmar, *Adiyān kī Jang Dīn-i-Islām yā Dīn-i-Jamhūriyyat?* Ibid., 44.

[14] Sayyid Abū al-Aʿlā Mawdūdī, *Islāmī Tahdhīb aur us ke Uṣūl o Mabādī* (Lāhore: Tarjumān al-Qur'ān, 1960), 115.

[15] ʿAllāmah Muḥammad Iqbāl, *Tashkīl-i-Jadīd Ilāhiyāt-i-Islāmiyyah* (Lāhore: Bazm-i-Iqbāl, 1958), 174.

[16] ʿAllāmah Muḥammad Iqbāl, *Tashkīl-i-Jadīd Ilāhiyāt-i-Islāmiyyah* Ibid., 162.

[17] Sayyid Abū al-Aʿlā Mawdūdī, *Islāmī Tahdhīb aur us ke Uṣūl o Mabādī* Ibid., 88.

[18] ʿAllāmah Shiblī Nuʿmānī, *Maqālāt-i-Shiblī* (Delhī: Rangīn Press, 1923), 112.

[19] Dr. Nijātullāh Ṣiddīqī, *Islām kā Maʿāshī Niẓām* (Delhī: Maktabah Jamāʿat-i-Islāmī Hind, 1971), 98.

[20] Alija Izetbegović, *Islām aur Mashriq o Maghrib kī Tahdhībī Kashmakash* tarjamah: Muḥammad Ayyūb Munīr, (Lāhore: Metro Printers, 2016), 75.

[21] ʿAllāmah Yūsuf al-Qaraḍāwī, *Fiqh al-Zakāt* (Lāhore: Al-Badr Publications, 2007), 45.

[22] Dr. Faḍl-ur-Raḥmān Anṣārī, *Islām aur Maghribī Tahdhīb* tarjamah: Dr. Ḥabīb-ur-Raḥmān, (Karāchī: Seerat Research, 2021), 154.

[23] Dr. Nijātullāh Ṣiddīqī, *Islām kā Maʿāshī Niẓām* Ibid., 118.

[24] ʿAllāmah Yūsuf al-Qaraḍāwī, *Fiqh al-Zakāt* Ibid., 45.

[25] ʿAllāmah Muḥammad Iqbāl, *Tashkīl*-i-*Jadīd Ilāhiyāt*-i-*Islāmiyyah* Ibid., 200.

[26] Dr. Muḥammad Ḥamīdullāh, *Khuṭbāt*-i-*Bahāwalpūr* (Islāmābād: Idārah Taḥqīqāt-i-Islāmī, 1985), 193.